کشادہ رہتا تھا اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں شب و روز یوسفؑ کی طرف نگراں رہتی تھیں۔

عاشقانہ

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں | جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

عاشقانہ

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار | جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے سبب اوپر نہیں اُٹھتیں، بلکہ پلکوں کیطرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔

شوخی

وھاں گیا بھی میں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب | یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اِس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ظاہر کرتا ہے کہ گویا اُسکو ہر شخص ضروری جانتا ہے؛ کیونکہ سب سے حیراں ہوکر پوچھتا ہے کہ بتاؤ اُنکی گالیوں کا کیا جواب دونگا جبکہ دعائیں سب نبٹ چکیں۔

تصوف

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم | ملتیں جب مٹ گئیں اجزاے ایماں ہوگئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے۔ جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے؛ اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزاے ایمان بنجاتی ہیں۔

تصوف

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا | دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیمروز | آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

حقیقت و مجاز دونو پر محمول ہو سکتا ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونو ایک ہیں | موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اخلاق

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو | کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے، بلکہ حقیقت واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور، دنیا کے حالات سے ناواقف، اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بے خبر، ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا؛ لیکن جس قدر اُسکا دائرۂ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی قدر اُسپر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے۔ جسپر حسد و رشک کیا جائے۔ بلکہ اُنکی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے؛ اور اس لئے انصاف اور فیاضی اُسکے دل میں پیدا ہوتی ہے؛ اور وہ خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجاے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے پر متوجہ ہوجاتا ہے۔ اِس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ ”چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو“، جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے۔

وفاداری

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں | بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ صواب سے | ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

استقلال

آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں | ایرا ہی دیکے ہمنے بچایا ہے کشت کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں | کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا | رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید ✽ مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں ازراہِ تہذیب اُس کام کا ذکر نہیں کیا جسکے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ - جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا۔ جب وہی چھٹ گیا اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کے کی گئی ہے ؛ یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے۔ اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اس شعر کو حقیقت و مجاز دونو پر محمول کر سکتے ہیں۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

اُس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جسکے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو ! ہم دل میں نہیں ہیں - پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

اس شعر میں مخاطب معشوقِ حقیقی ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یعنی جب غم دنیا سے سر اُٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اُٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اُسکے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے۔ غرضکہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار اُس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف بآسانی کزلک وغیرہ سے اُڑ سکے، اور کاغذ پر اُسکا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں ازراہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے ہیں جسپر سے حرف غلط خود بخود اُڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تونے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکے خط کا کاغذ غلط بردار ہے - کہ جو بات سچے دل سے اُسپر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ جسکے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق۔ عذر خواہ معافی چاہنے والا، یا معذور رکھنے والا۔ اس شعر میں دعویٰ ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعوے متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں - اُن کی بدمستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جسکے پرتو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔

جنس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خوڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
زندگی اپنی جب اس رنگ سے گذری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون تھوڑے سے فرق کے ساتھ فارسی غزل میں بھی مرزا صاحب نے باندھا ہے اور وہ یہ ہے

"گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت — می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت"

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے — بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے
غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے — گر حیا بھی اُسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

یہ شعر معاملہ کا ہے۔ جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گذرتا ہے؛ اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرع میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے؛ پھر اسکے کیا معنی؟ کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اِس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے؛ اور شرما جانے کا متعلق اور۔ گر حیا بھی اُسکو آتی ہے،، یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے۔ او شرما جاے ہے،، یعنی غیر سے یا اُسکے ساتھ تکرار کرنے سے۔

ہو کے عاشق وہ پریرخ اور نازک بن گیا — رنگ کھلتا جاے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے و لے باایں ہمہ — ذکر میرا مجھسے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس ہجومِ ناامیدی خاک میں ملجائیگی — یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بےحاصل میں ہے
فردا و دِی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا — تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

کہتا ہے کہ تمھارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی کہ آج اور کل کی مطلق

تمیز نہیں رہی؛ اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونو مبدل بزمانۂ حال ہوجائینگے۔ پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گذر گئی۔ قیامت گذر جانے کے دونو معنی ہیں؛ نہایت سختی کا زمانہ گذرنا، اور خود قیامت کا آجانا۔

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھکو بعدِ قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے
دے کے خط مُنھ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
ہوچکیں غالبؔ بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے
کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے، اور معشوق و عاشق میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اُنسے ناواقف ہے؛ اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے معشوق کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔

میں بھی مُنھ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں مُنھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی محض ازراہ شوخی کے کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اسکے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں، تاکہ نکیرین اُسکی بو کی کراہت سے بغیر سوال جواب کئے چلے جائیں۔

جلا دسے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے　　ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے　　جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے　　اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
چھوڑی اسدؔ نہ ہمنے گدائی میں دل لگی　　سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے
سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر　　تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر　　کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے
حسنِ مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے　　اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرع میں دعوی متضمنِ دلیل ہے معشوق کو مہِ خورشید جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اُسکو ماہِ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ　　جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اسمیں سوا ملتا ہے　　وہ گدا جسکو نہو خوئے سوال اچھا ہے
اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق منہ پر　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اسی کے قریب قریب سعدی رح کا بھی ایک شعر ہے وہ کہتے ہیں "گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم

چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی"، دونو کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے مگر سعدی کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہری بدحالی دیکھکر سمجھ جائے کہ اسکا دل مغموم ہے کیونکہ سعدی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے مگر مرزا کے بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا باایںہمہ سعدی کے شعر کو بہرحال مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہئے کیونکہ الفضل للمتقدم۔

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض　　اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اسکے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا وبا نہیں آنے کی یا لڑائیاں نہیں ہونگی وغیرہ وغیرہ۔

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا　　اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم　　آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف　　آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل　　جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
وہ چیز جس کے لئے ہمکو ہو بہشت عزیز　　سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا　　دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہو — ہم تو ہیں عاشق تمھارے نام کے
عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اسکو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے بادپیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب — شاہِ دیندار نے شفا پائی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی کہتا ہے کہ میری قدر اُس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہوا اور ہر شخص آتے جاتے اُسپر پاؤں رکھکر گذرے یعنی ہوں تو گراں قدر، مگر اُس پتھر کی طرح بے قدر ہوں پس میری گرانی کس قدر ارزاں ہے۔

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا — کھل گئی ہیچمدانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی — لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور — دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

لفظ تو نے جو دوسرے مصرع میں ہے یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا۔ اس لئے دوست کے سرِ انگشتِ حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اسکی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بےحوصلگی سے — یہاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

بےحوصلگی یعنی کم ظرفی یہاں سے مراد دنیا معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ظلم سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کرینگے کیونکہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو یہاں کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل — کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

پھول کے کھلنے کو چاکِ گریباں سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے کہتا ہے کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہئے، پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان چاک مت کر اسمیں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوشِ جنوں زیادہ ہوتا ہے۔

پلادے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے - نہیں ہے
کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد — مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

مگس کی قے یعنی شہد زاہد جو شہد کے پینے کو موجبِ ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اُسکو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

اعجاز

ہائے وہاں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا   لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے   تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔

عاشقانہ شوخی

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے   عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہے مجھسے   جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھسے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اسکی کیا تلافی ہو سکتی ہے نیکی نہیں کر سکتا۔

عاشقانہ

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے   کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھسے

ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی   نہ بھاگا جائے ہے مجھسے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھسے

اسمیں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ تو ہے جن سے عشق کے ترک کرنے یا اسکے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی ابتداے عشق میں انھیں کو صدمہ پہنچا ہے پس اب عشق ترک ہو سکتا ہے نہ اسپر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔

تصوف

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے   ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک   اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے   نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالب   خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے   دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا۔ بے شرم و بیباک ہونا۔ پاک ۔ آزاد یا شہدا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفاے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ "رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے" بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ   کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

شاہدِ حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اسکو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے

رباعی

اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ   دورِ تو و نزدیک ترا حال تباہ

کس نیست کہ جاں از تو سلامت ببرد   آں را بہ تغافل کشی ایں را بہ نگاہ

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسکے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اسکی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے جب اسنے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہمکو فنا کر دیا۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی   مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

صوفیہ کی اصطلاح میں محادثت اور مسامرت (یعنی عبد اور معبود کے درمیان گفتگو ہونا) دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں کہتا ہے کہ شاہدِ حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت

نہیں ہوسکتی بلکہ اُسکے لئے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہئے یعنی جب تک دل تیغِ عشق سے مجروح نہو یہ شیوہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

عاشقانہ

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو صبر کی آزمائش ہی میں گذر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کیجاتی۔

تعریض

بات پر وہاں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

اخلاق

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

اخلاق

روک دو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

شکایت

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

ناامیدی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہش پر دم نکلنا اُسکے پورے ہونیکے لئے جلدی کرنا چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو یعنی کیوں جلدی کرتے ہو پہلے مصرع میں بمقتضاے مقام یہ الفاظ کہ "دل میں باقی رہی" مقدر ماننے چاہئیں باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

شکایت

نکلنا خلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے مصرع میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہئے تاکہ آدمؑ کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔

شوخی

بھرم کھلجائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

تیغ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یہاں انتظار ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

یہ خطاب ہے آفتابِ حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ متہم بوجود ہے اور فی الواقع اُسکی کچھ ہستی نہیں ہے اُسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں اگر آفتابِ حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر پرتو فگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنافی الشمس ہو جاویں، کیونکہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونو پہلو رکھتا ہے؛ مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسیکو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُسنے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کرونگا حضور کی

اس شعر سے مرزا کی کمال شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اُس زمانے میں لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں؛ یہاں تک کہ اُسکے لئے منت مانتے ہیں؛ مگر منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا

ثواب حضور کی نذر کرونگا۔ اُدھر سفرِ حج کا وہ اشتیاق اور اِدھر حج کے ثواب کی یہ بیقدری۔

رندانہ قناعت
غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے　　یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھکو　　ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

ذلت
یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لئے کافی ہے مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل و رکم ہمت اور قانع ہیچ نہ سمجھے اُسپر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

قناعت
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں　　گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اُسکا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔

عاشقانہ
بلاسے گر مژہ یار تشنہ خوں ہے　　رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلئے

شوخی
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

کوشش
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر　　کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

اِس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرائے میں بیان نہیں ہو سکتی۔

شوخی
گدا سمجھکے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے　　اُٹھا اور اُٹھکے قدم میں نے پاسباں کیلئے

اُردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے اندازِ بیان پر پروانہ تھے۔ ہمنے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ بیان کیا ہے یہاں اُسکی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اسمیں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک

کیا دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونو باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے۔ اِسکے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اُس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

اس غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بُلایا تھا مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا اُن مدحیہ اشعار میں سے صرف دو شعر اس مقام پر لکھے جاتے ہیں۔

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے　　بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زمانہ عہد میں ہے اُسکے محوِ آرائش　　بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

قطعات

قطعہ ۱

یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اس درخواست سے گذرانا تھا کہ اُنکی تنخواہ جو ششماہی گذرنے پر اکھٹی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی وہ ماہ بماہ ملا کرے چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ　　اے جہاندارِ آفتاب آثار